یکساں سول کوڈ اور مسلمان

صدرالدین اصلاحی

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

مطبوعاتِ اشاعتِ اسلام ٹرسٹ — ۱۱۴

یکساں سول کوڈ

اور

مسلمان

صدرالدین اصلاحی

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

بار اول ——— جون ۱۹۸۳ء ——— ۴۰۰۰
بار دوم ——— ستمبر ۱۹۸۵ء ——— ۵۰۰۰

قیمت : ۲/۵۰

مطبوعہ
جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

ہندوستان کے مسلمان آج کل جن سنگین مسائل سے دوچار ہیں ان میں مُسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ سرِ فہرست ہے۔ یہ مسئلہ جس بنا پر پیدا ہوا ہے وہ یکساں سِول کوڈ کی وہ تجویز ہے جو حکومت کے ذمہ داروں اور ملک کے بعض اہم طبقوں کے ذہن میں پوری شدّت کے ساتھ موجود ہے۔ یکساں سِول کوڈ بننے کے معنی چونکہ مُسلمانوں کے اپنے شخصی قوانین کی منسوخی کے ہیں اس لئے وہ اس تجویز کے باعث سخت اضطراب میں مبتلا ہیں۔ اِس اضطراب کو سمجھنے سے اس تجویز کے حامی اور علمبردار برابر قاصر ثابت ہو رہے ہیں۔ بلا سوچے سمجھے اُن کا خیال یہ ہے کہ مُسلمانوں کا یہ واویلا صرف جذبات کی پیداوار ہے۔ یہ کتابچہ اسی غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے لِکھا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے مطالعہ سے معاملے کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ ایک طرف تو عام مسلمانوں کو بھی وضاحت سے معلوم ہو جائے گا کہ کِتنا بڑا طوفان ہے جو اُن کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے، اور اس نے ان پر اپنے شخصی قوانین کے تحفظ کے سلسلے میں کِتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے، دوسری طرف اربابِ حکومت کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ کتنا غلط قدم ہے جو وہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔

صدر الدین اصلاحی
۲۸- مئی ۱۹۷۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکساں سول کوڈ کی تجویز
اور
اُس کے مقاصد

مفہوم یکساں سول کوڈ **Uniform Civil Code** کا مفہوم جیساکہ اس اصطلاح کے الفاظ خود بتا رہے ہیں، دو باتوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ ہندوستان کے سارے شہریوں کے لیے شخصی قوانین بالکل 'یکساں' اور مشترک ہوں۔

دوسری یہ کہ یہ قوانین 'سول' یعنی خالص دُنیوی اور وضعی نوعیت کے ہوں، اور مذہب سے اُن کا کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ تمام تر انسان کی اپنی ہی صوابدید کی پیداوار ہوں۔

ان دونوں باتوں کی بنا پر یکساں سول کوڈ کی تجویز کا مدعا واضح طور پر یہ ہوا کہ یہاں کی پارلیمنٹ (لوک سبھا اور راجیہ سبھا) عائلی اور معاشرتی معاملات کے بارے میں بطورِ خود ایک مجموعۂ قوانین بنا دے، اور پھر اس وقت کے رائج سارے

شخصی قوانین کو منسوخ کر کے (جن میں مسلم پرسنل لا خصوصیت سے شامل ہے) مُلک کے تمام باشندوں — ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، یہودیوں سبھی — پر اسی ایک مشترک مجموعۂ قوانین کو نافذ کر دیا جائے۔ جس کے بعد ہر فرقے اور ہر فرد کے شخصی اور معاشرتی مسائل لازماً اسی کے تحت آجائیں گے، اور اب وہ اس کے متعین کیے ہوئے ضابطوں کے مُطابق ہی انجام پاسکیں گے اور فیصل ہو سکیں گے۔ نہ مذہب کی کوئی "ہاں" یا "نہیں" اس ضمن میں کسی سماعت کے قابل ہوگی، نہ کسی مذہبی اختلاف کو کوئی اہمیت حاصل ہوگی — نکاح کے جائز اور قانونی قرار پانے کا انحصار صرف اس کوڈ میں پائی جانے والی دفعات پر ہوگا، کسی 'کتابِ الٰہی' کی عائد کی ہوئی پابندیوں اور دی ہوئی ہدایتوں کا پاس یکسر خارج از بحث ہوگا۔ طلاق صرف ان ہی ضابطوں کے مُطابق دی جاسکے گی، اور واقع ہو سکے گی جو اس قانون میں مذکور ہوں گے۔ کوئی مذہب اس بارے میں کیا کہتا ہے، اس طرح کا کوئی سوال ہی نہ اُٹھ سکے گا۔ وراثت کے حق دار وہی لوگ قرار پاسکیں گے، اور ان کو حصے بھی اتنے ہی ملیں گے جن کی، اس کامن سول کوڈ میں، تعیین کر دی گئی ہوگی، خواہ متعلقہ افراد کا نام نہاد "قانونِ شریعت" کچھ کہہ رہا ہو۔ اسی طرح دُوسرے تمام شخصی معاملات — مہر، شہادت، نفقہ، زوجین کے حقوق، ثبوتِ نسب، خلع، ایلاء، عدت، وصیت، تبنّی، وقف اور ہبہ وغیرہ — بھی سب اسی سول کوڈ کے زیرِ نگیں رہیں گے اور اس کے مُطابق ہی انجام پاسکیں گے، کسی اور قانون اور ضابطے، رواج یا شریعت کو دخیل ہونے کی بالکل اجازت نہ ہوگی کیونکہ اس کی کوئی قانونی حیثیت باقی ہی نہ رہ جائیگی۔

یہاں دوسرا ہر قانون کالعدم ہو چکا ہوگا۔ اب نہ یہاں 'مسلم پرسنل لا' نام کی کوئی چیز تسلیم شدہ باقی رہ جائے گی، نہ 'ہندو لا' کے نام کی، اور نہ کسی اور 'لا' کے نام کی۔ صرف ایک لا کی حکم رانی ہوگی، اور وہ ہوگا یکساں سول کوڈ۔

یہ ہے یکساں سول کوڈ کا پورا مفہوم، اور یہ ہے وہ تجویز جسے ہندوستان جیسے کثیر المذاہب اور مذہب پسند ملک کے لیے سوچا گیا ہے اور جس کو قانون کا جامہ پہنا دینے کے لیے مختلف سطحوں پر منصوبہ بند کوششیں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی اہمیت کی تجویز ہے، اور اگر یہ زیر عمل آجاتی ہے تو اس کے نتائج بڑے ہی دور رس ہوں گے۔ اتنی اہم تجویز کے بارے میں کوئی رائے زنی اس وقت تک مناسب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے سارے نظری، مقصدی اور استدلالی پہلو واضح طور پر سامنے نہ ہوں۔ اس لیے آئیے پہلے اس تجویز کا مکمل تعارف حاصل کرلیں۔

فکری بنیاد اور نظریاتی فلسفہ

اس تجویز کی فکری بنیاد اور اصل الاصول یہ نظریہ ہے کہ انسانی زندگی کے معاملات، خواہ وہ اجتماعی نوعیت کے ہوں خواہ شخصی اور عائلی قسم کے، خالص دنیوی حیثیت رکھتے ہیں، مذہب اور مذہبیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ مذہب عالم روحانیات کی چیز ہے، نہ کہ عالم مادیات کی۔ اس کا مرکز توجہ صرف قلب ہے، نہ کہ جسم بھی۔ وہ صرف باطن سے بحث کرتا ہے، نہ کہ ظاہر سے بھی۔ اس کا مقصود، انسانی روح کو پاکیزہ اور تابناک بنانا ہے، نہ کہ اس کی دنیوی زندگی کے کھٹراگ میں الجھنا۔ اس لیے اس زندگی کے مسائل اور معاملات اس کی دل چسپی کی چیز ہو ہی نہیں سکتے۔ اور جب یہ مسائل اس کی دل چسپی کی چیز نہیں ہو سکتے تو ان کا حل معلوم کرنے کے لیے اس کی طرف

دیکھنا غیر ضروری ہی نہیں غلط اور بے فائدہ بھی ہے۔ اب جبکہ دُنیا۔ کے مسائل و معاملات سے اور ان کے حل کی بحث سے مذہب الگ ہے، تو ضروری ہے کہ اس حل کے لیے عقل اور تجربے کی طرف رجوع کیا جائے۔ کیونکہ یہی عقل اور تجربہ وہ چیزیں ہیں جو صحیح اور غلط، مناسب اور نامناسب، مُفید اور مضر کی معرفت بخشتی اور بخش سکتی ہے۔ وہی رہنمائی کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں اور حق بھی۔ پس دُوسرے تمام معاملات کی طرح شخصی اور عائلی معاملات کے بارے میں بھی قوانین وضوابط وضع کرنا صرف انسانی عقل و صوابدید ہی کا کام ہے، نہ کہ کسی اور شے کا۔

یہ تو شخصی قوانین کے 'سول' (غیر دینی) ہونے کی فکری اساس تھی۔ ان کے 'یُونی فارم' (یکساں اور مشترک) ہونے کی اساس بھی اسی اصل الاصول پر مبنی ہے۔ یعنی قوانین کے نامذہبی اور وضعی ہونے ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ سارے شہریوں کے لیے یکساں ہوں۔ یہ اس لیے کہ اگر حقیقت یہ ہے کہ مسائلِ زندگی کا حل بتانے والی اور ان کے سلسلے میں مناسب قوانین وضع کر سکنے والی شے انسان کی اپنی عقل اور صوابدید ہی کو ہونا چاہیے، تو بات اب یہ نہیں ہو سکتی کہ ایک ہی مُلک کے باشندوں کے لیے، محض اختلافِ مذاہب کی بنا پر، یہ 'حل' اور یہ 'قوانین' مختلف ہوں، ایک فرقے کے لیے تو نکاح اور طلاق، وراثت اور وصیت کے ایک طرح کے قوانین موزوں ہوں، اور دُوسرے فرقے کے لیے کچھ دُوسری طرح کے۔ کیونکہ درمیان سے 'مذہب' کی بحث ہٹ جانے کے بعد سماجی مصلحتیں اور تمدّنی ضرورتیں ہی ان قوانین کی واحد بنیاد ہوں گی، اور انہی کو سامنے رکھ کر یہ قوانین بنائے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سماجی مصلحتیں اور تمدّنی ضرورتیں سارے

باشندگانِ مُلک کی ایک ہی جیسی ہیں اور رہیں گی، یہ سوچنا خلافِ واقعہ ہوگا کہ ایک ہی مُلک کے رہنے اور ایک ہی نظامِ اجتماعی کے تحت زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے مسائل اور مصالح مختلف ہوں گے۔ یہ مسائل اور مصالح یقیناً عام اور ہمہ گیر ہوں گے۔ اِس لیے ان مسائل کے حل اور ان مصالح کی تکمیل کے لیے بنائے جانے والے شخصی قوانین بھی ہمہ گیر ہی ہونے چاہئیں۔ یہ بالکل غیر منطقی بات ہوگی کہ مختلف فرقوں کی عائلی اور معاشرتی زندگی کی تنظیم و ترتیب کے لیے الگ الگ قوانین کی ضرورت محسوس ہو۔ ایک ہی جیسے حالات، مصالح اور سماجی ضروریات سے دوچار افراد کے لیے قوانین و ضوابط بھی ایک ہی سے درکار ہوسکتے ہیں۔ اِس لیے اہلِ ہند کے لیے مناسب شخصی قوانین کا جس طرح سول (نامذہبی) ہونا ضروری ہے اسی طرح ان کا یکساں (یونی فارم) ہونا بھی ضروری ہے۔

مبینہ وجوہ و مقاصد

یکساں سول کوڈ کی یہ تجویز، تجویز کے حامیوں اور علم برداروں کے نزدیک، صرف یہی نہیں کہ نظری اور اصولی لحاظ سے ایک معقول اور ضروری تجویز ہے، بلکہ بہت سے اہم مقاصد بھی اس سے وابستہ ہیں، اور یہ مقاصد اس وقت تک پورے نہیں ہوسکتے جب تک کہ ملک میں ایک ہی قانونِ شخصی کا نفاذ نہ کر دیا جائے۔ یہ اہم اور عظیم مقاصد ان لوگوں کی وضاحت کے مطابق حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ قومی اتحاد کا حصول

سب سے پہلا مقصد قومی اتحاد اور ملکی یک جہتی کا حصول ہے۔ چونکہ یہ اتحاد مُلک کی ترقی اور اہلِ مُلک

کی فلاح و خوش حالی کی لازمی شرط اور بنیادی ضرورت ہے اِس . لیے یکساں سول کوڈ کا یہ مقصد بھی سب سے اہم مقصد ہے ۔ یکساں سول کوڈ کے بغیر قومی اتحاد اس لیے حاصل نہیں ہو سکتا کہ فرقے فرقے کے الگ الگ پرسنل لا ان کے درمیان غیریت کی دیوار بنے رہیں گے ، وہ انھیں برابر یہ احساس دلاتے رہیں گے کہ وہ ایک قوم نہیں بلکہ مختلف سماجی گروہ ہیں ، جنھیں جغرافیائی اتفاق نے اکٹھا کر رکھا ہے ۔ یہ احساس انھیں کبھی متحد اور یک جہت نہ ہونے دے گا. اِس لیے اگر ملک کا اتحاد عزیز ہے تو تمام فرقوں اور اکائیوں کو ایک مشترک قانون کے تحت لانا قطعی ضروری ہے ۔

۲۔ سیکولرزم کے دستوری منشا کی تکمیل

دُوسرا مقصد دستورِ ہند کے منشا کی تکمیل ہے ۔ یہ دستور سیکولر ہے ۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ اہلِ مُلک کا باہمی رویّہ ہی نہیں ، زندگی کے مسائل اور معاملات میں ان کا طرزِ فکر و عمل بھی نامذہبی ہو ۔ ان کے مذہبی عقائد اور طریقِ عبادت میں چاہے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو ، مگر جہاں تک ان کے دنیوی معاملات کا تعلق ہے ضروری ہے کہ وہ ان میں فکر و نظر کا 'دنیوی' انداز ہی اختیار کریں ۔ اگر ایسا نہ ہوا ، اور مختلف اِکائیاں اپنے اپنے ماضی سے چمٹی رہیں ، ہر فرقے نے اپنے لیے الگ پرسنل لا پر اصرار کیا ، تو ملک اور ملکی زندگی میں سیکولرزم کی رُوح کبھی جاری و ساری نہ ہو سکے گی ۔ یہی مُدعا تھا جس کی خاطر دستورِ ہند کے رہنما اصُولوں میں ، بجا طور پر ، ایک اُصول یہ بھی رکھا گیا کہ :۔

"ریاست کوشش کرے گی کہ پوری مملکتِ ہند میں یکساں سول کوڈ وجود میں لائے۔" (دستور ہند دفعہ ۴۴)

یکساں سول کود کے ان دونوں مقاصد — قومی اتحاد کا حصول، اور سیکولرزم کے دستوری منشا کی تکمیل — کو آئے دن بڑی شدومد سے پیش کیا جاتا رہتا ہے۔ ملک کے ایک نامور اور ممتاز دانش ور، سابق چیف جسٹس اور لا کمیشن کے موجودہ چیرمین، ڈاکٹر پی، بی گجیندر گدکر کی زبان سے، جو اس وقت سیکولرزم کے بہت بڑے نقیب اور نظریاتی شارح مانے جاتے ہیں، اس سلسلہ کی بالکل کھلی ہوئی وضاحتیں سنیئے۔

"ہندوستان کا اتحاد" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"سیکولرزم کی ایک بے حد اہم شرط آزادیِ مذہب کے سلسلے میں ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن جن معاملات میں ہندوستانی جمہوریت پیچیدہ سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کو حل کرنے میں مصروف ہے ان میں مذہب کی کوئی آواز نہیں۔"

اپنے اس اصولی نظریے کا عملی انطباق کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں کہ:-

"ہندو برادری کے لئے سیکولرزم کا اعلان ہے کہ گاؤکشی پر پابندی کے مسئلے کا فیصلہ صرف سماجی اور معاشی بنیادوں پر ہوگا، مذہب کی بنیاد پر نہیں۔ مسلم برادری کے لئے سیکولرزم کا اعلان ہے کہ مشترک سول کوڈ کے مسئلے پر، اور تعدد ازدواج کو ختم کرنے کے مسئلے پر سماجی بنیادوں پر غور ہوگا، قرآن کے حوالے سے نہیں۔ اور عیسائی برادری کے لئے سیکولرزم کا اعلان ہے کہ

خاندانی منصوبہ بندی کے فوری مسئلے کا فیصلہ صرف عقلی بنیاد پر ہوگا اور پاپائے اعظم کے فرمان کو اِس سلسلے میں نہ بطور جواز پیش کیا جائیگا اور نہ اُس کو دلیل مانا جائیگا۔"

"اتحاد (ملکی) کا فلسفہ یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ اپنی زبان اور مذہب سے وفاداری رکھی جائے، لیکن اصرار یہ کرتا ہے کہ اصل اور اعلیٰ وفاداری ہندیونین اور سیکولرزم سے ہونا چاہیئے"۔ (بحوالہ قومی آواز ۱۶ ؍ دسمبر ۱۹۶۸ء)

۳۔ ترقی دشمن دقیانوسیت سے نجات

تیسرا مقصد اور محرک یہ ہے کہ باشندگانِ ملک دقیانوسیت اور ظلمت پسندی سے نجات پاکر وقت کا ساتھ دینے کے قابل ہو جائیں، اور ان کی سماجی زندگی ایسے خطوط پر استوار ہو جائے جو اسے بیسویں صدی کی روشن، مہذب، متحرک اور ترقی یافتہ زندگی بنا دیں۔ یہ 'ہندو لا' اور یہ 'محمڈن لا' صدیوں پہلے اپنے اپنے خاص ماحول اور خاص حالات میں وضع ہوئے تھے۔ اب انسانی تمدن کوسوں آگے بڑھ آیا ہے۔ حالات بدل گئے ہیں۔ مسائل بدل گئے ہیں ضرورتیں بدل گئی ہیں، قدریں بدل گئی ہیں، سماجی تقاضے بدل گئے ہیں۔ غرض انسانی زندگی کی زمین آسمان سب بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ اِس لیے اب وہ پُرانے اور فرسودہ قوانین کارآمد باقی نہیں رہ سکتے جو سیکڑوں برس پہلے کے بالکل مختلف ماحول میں، اور سادہ زندگی کے سادہ مسائل کے لیے بنائے گئے تھے۔ یقیناً وہ اُس زندگی اور اُن مسائل کے لیے بہت موزوں اور بہت اچھے قوانین تھے لیکن اُن کی موزونیت اور اچھائی جو کچھ بھی تھی، قدیم ادوار ہی کے لیے تھی۔ آج بھی اگر ان سے چمٹا رہا جائے گا تو وہ پاؤں کی زنجیر بن جائیں گے، اور موجودہ سماجی

مسائل کی پیچیدگیوں کا کوئی حل نہ مل سکے گا۔ جس کا اثر پوری زندگی کی رفتار پر بہت بُرا پڑے گا۔ نہ صرف یہ کہ اہلِ ملک سماجی طور پر پس ماندہ رہ جائیں گے، بلکہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی زمانے کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ اس لیے ان کے حقیقی مفاد کا ناگزیر تقاضا ہے کہ ان کی عائلی اور معاشرتی زندگی کو ان کے ازکار رفتہ شخصی قوانین کی قید و بند سے آزاد کر دیا جائے، اور ان کی جگہ ایسے جدید قوانین بنا کر نافذ کر دیے جائیں جو زمانے کے نئے حقائق اور مُطالبات سے ہم آہنگ ہوں، اور جو ماضی کی روایات کو نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے خالص سماجی مصالح کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہوں۔

تجویز حقیقت اور معقولیّت کے آئینہ میں

جائزے کی ضرورت

'یکساں سول کوڈ' کی تجویز کا مفصل تعارف آپ کے سامنے آچکا۔ اب آئیے ایسی ہی تفصیل کے ساتھ اُس کا جائزہ بھی لے لیں، اور دیکھیں کہ اس کی نظریاتی بنیاد کتنی مستحکم اور مطابقِ حقیقت ہے؟ اور اس کے مبینہ مقاصد کتنے معقُول ہیں؟ تاکہ اس کی مخالفت یا موافقت کا، جو بھی رویّہ اپنایا جائے، دلیل اور بصیرت کی بنا پر اپنایا جائے۔

سب سے پہلے اس تجویز کی فکری اور نظریاتی بنیاد کو لیجیے۔ کیونکہ یہی بنیاد وہ شے ہے جس پر تجویز کی پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اس لیے منطقی طور پر اسے زیرِ بحث مسئلہ میں فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ اگر جائزے اور تحقیق نے اس فکری بنیاد کی توثیق کردی تو پھر یکساں سول کوڈ کی اس تجویز کو ایک صحیح اور معقول تجویز ہی نہیں، ایک ناگزیر ضرورت کہنا بھی غلط نہ ہوگا۔ لیکن اگر امر واقعی یہ نہ نکلے، تحقیق سے معلوم یہ ہو کہ 'مذہب' کا یہ ماورائی تصور، جسے اس تجویز کی فکری اساس اور بنیادی فلسفہ قرار دیا گیا ہے، غلط اور خلافِ واقعہ ہے، تو پھر اس دعوے کو مذہب کے ساتھ فریب بلکہ اس کے خلاف ایک شاطرانہ اقدام ہی کہا جائے گا جس کا راز کُھل جانے کے بعد یکساں سول کوڈ کی پُوری عمارت زمین پر آرہے گی۔

نظریاتی فلسفے سے اسلام کا قطعی اختلاف

دُوسرے مذاہب اس بارے میں کیا کہتے ہیں، یہ وہ جانیں۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ اس نظریے کو، کہ مذہب زندگی کے معاملات سے کوئی بحث نہیں رکھتا، پُوری قطعیت سے رد کرتا ہے، اور اسے خُدا کا فرمودہ نہیں بلکہ انسان کا خود ساختہ نظریہ قرار دیتا ہے۔ وہ بالکل واشگاف انداز میں کہتا ہے کہ خدا پرستی صرف باطن کے ریاض کا نام نہیں، نہ اس کی راہ زندگی کے مسائل سے کترا کر گذرتی ہے، نہ اس سلسلے میں 'دُنیا' اور 'دین' کی تفریق کے کوئی معنی ہیں اس کے بخلاف خُدا پرستی نام ہے صرف اس بات کا کہ انسان اپنی پوری زندگی اپنے معبود و فرماں روائے حقیقی کے حوالہ کر دے، اور زندگی کے سارے معاملات اس کی ہدایت کے مطابق سر انجام دے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تعلیمات جس طرح ذکر و فکر، حمد و تسبیح، نماز اور زکوٰۃ، روزے اور حج پر مشتمل ہیں، اسی طرح زندگی کے اجتماعی اور انفرادی سبھی معاملات کے بارے میں احکام و ہدایات بھی اُن کے اندر موجود ہیں، اور ان احکام و ہدایات کی پابندی کو بھی وہ اسی طرح تقاضائے دین و ایمان قرار دیتا ہے جس طرح نماز روزے کے احکام کی پابندی کو۔ اور جہاں تک عائلی اور معاشرتی معاملات نکاح اور طلاق، وراثت اور وصیت وغیرہ ـــ کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو قرآن حکیم نے اتنے تفصیلی احکام دیے ہیں جتنے کسی بھی شئے کے بارے میں نہیں دیے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس نے بڑی تفصیل سے یہ احکام دیے ہیں، بلکہ مُسلسل اس حقیقت کی بھی صراحت کرتا گیا ہے کہ اُن کی پابندی ہر مُسلمان پر واجب اُسکے مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا، اور آخرت میں نجات کی شرط ہے[1]۔ جب امرِ واقعہ یہ ہے، جس کا انکار کسی طرح ممکن بھی

---

[1] اس موضوع پر مدلل اور سیر حاصل بحث کے لئے مصنف کی کتاب 'مسلم پرسنل لا دینی و ملّی نقطۂ نگاہ سے' کا مطالعہ کیجئے

نہیں، تو خواہ کسی کو یہ بات پسند آئے یا ناپسند، مگر اُسے یہ بہر حال ماننا پڑے گا کہ یکساں سول کوڈ کے نظریاتی فلسفہ کا اطلاق کم از کم اسلام اور اُس کے دیئے ہوئے شخصی قوانین پر ہرگز نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ قرآن عزیز اس نظریئے کو پوری شدت اور قطعیت سے رَد کرتا ہے اور اگر اس کے باوجود بھی کوئی یہ اعلان کرنے پر بضد ہو کہ "ان مسائل پر صرف سماجی بُنیاد پر غور ہوگا، قرآن کے حوالے سے نہیں" تو یہ اعلان طاقت کے غرور اور جبر کا اعلان تو ہو سکتا ہے، سچے انصاف اور سچی دانش وری کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسے سر کی آنکھوں سے دِکھائی دینے والے حقائق کو سچ قرار دے دینے کی 'جرأت' تو ضرور کہہ سکتے ہیں، لیکن حقیقت پسندی اور صداقت کا اعتراف کسی حال میں نہیں کہہ سکتے۔

بلاشبہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو یکساں سول کوڈ کی اِس فکری بنیاد کا اسلام پر بھی اِطلاق کرتے وقت دَانستہ غلط بیانی سے کام نہیں لیتے، بلکہ فی الواقع وہ سمجھتے بھی ایسا ہی ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کی وجہ ان کا اپنا مخصوص ذہن، اپنا روایتی پس منظر اور اپنا مذہبی تصور ہے۔ ترکِ دُنیا اور رہبانیت کو خُدا پرستی کا اعلیٰ طریقہ باور کرنے کے باعث وہ کسی ایسے تصورِ دین کو اپنی فہم کی گرفت میں لینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے جو اس ترک و رہبانیت کی نہ صرف عظمت کا قائل نہ ہو بلکہ اُسے یکسر رَد کرتا ہو۔ ایسے لوگ معذور ہیں اگر ایسا سمجھیں کہ مذہب کا، خواہ وہ کوئی بھی ہو، انسان کی دُنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور یہ بات اس کے تقدس سے میل نہیں کھاتی کہ وہ اپنی نگاہ خدا اور نجات پر جمائے رکھنے کے بجائے ایک لمحہ کے لئے بھی مادی مسائل کی طرف پھیر دے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے شعور یا تحت الشعور میں مذہب کا یہ تصور سمایا ہوا ہو، یہ

ان کے بس کی بات بمشکل ہی ہو سکتی ہے کہ وہ اِسلام کے تصورِ دین کو اور اس کی تعلیمات کی جامعیت کو ایک حقیقت واقعہ سمجھ سکیں، اور پھر اُس کے اعتراف کا حق بھی ادا کر سکیں، بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ زمانے کا عام رُجحان، حالات کا دباؤ اور سیاست کا مطالبہ، جیسے زبردست عوامل بھی اس کے خلاف برابر زور لگا رہے ہوں۔ لیکن سُورج جیسی روشن حقیقت محض اس وجہ سے معدوم نہیں ہو جا سکتی کہ کچھ لوگ اپنی ناواقفیت یا اپنے ذوقِ خاص کی بنا پر اس کا مشاہدہ نہیں کر پاتے۔

غرض بات غلط بیانی کی ہو یا غلط فہمی کی، یکساں سول کوڈ کی فکری بُنیاد اور نظریاتی فلسفے کے اِطلاق سے اِسلام اور اُس کے شخصی قوانین کو باہر نہ قرار دینا حقیقت پسندی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔

قومی اتحاد کا انتہائی غلط تصور

اَب اِس تجویز کے بیان کردہ مقاصد کو لیجئے۔ ان مقاصد میں اولین اہمیت قومی اتحاد کے حصُول کے مقصد کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قومی اتحاد کی مُسلمہ ضرورت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ مختلف فرقوں کے علیحدہ علیحدہ شخصی قوانین کو ختم کر کے ایک مشترک سول کوڈ نافذ کر دیا جائے۔ یہ کہنے کے معنی واضح طور پر یہ ہیں کہ درج ذیل تین باتوں کو مُسلمہ قرار دے لیا گیا ہے:

۱۔ ایسا قومی اتحاد ناگزیر بھی ہے اور معقول و منصفانہ بھی، جس کی بُنیاد ہر فرقے کے پرسنل لا کی تنسیخ پر رکھی گئی ہو۔

۲۔ ایسا اتحاد قابلِ حصُول ہے۔

۳۔ ایسا اتحاد خارجی مصالح کے خلاف نہ ہوگا، اور بین الاقوامی سطح پر اس کے کسی ناپسندیدہ ردِّ عمل سے ملک کو دوچار ہونا نہ پڑے گا۔

لیکن کیا یہ باتیں فی الواقع بھی مسلّمہ ہیں؟ ظاہر ہے کہ جب تک دلائل و شواہد سے اس سوال کا جواب اثبات میں نہ مل جائے، قومی اتحاد کے لئے سول کوڈ کی ضرورت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اِس لئے آئیے، اِن تینوں نکتوں کا ترتیب وار جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ کہاں تک معقولیت اور حقیقت پسندی پر مبنی ہیں:۔

(۱) اجتماعیت کا ہر رمز شناس جانتا ہے کہ کسی خطۂ ارض کے رہنے والوں کو متحد کرنے اور متحد رکھنے والے اصل عوامل ان افراد کے ظاہر میں نہیں بلکہ ان کے داخل میں ہوا کرتے ہیں۔ انھیں جو چیزیں واقعۃً جوڑتی اور یک جہت بناتی ہیں وہ سطحِ زندگی کے طور طریقے نہیں، بلکہ کچھ ذہنی کیفیات، دِلی جذبات اور اخلاقی صفات ہیں، جنھیں باہمی اخلاص اور اعتماد، خیر سگالی اور رواداری، حقوق شناسی اور عدل پسندی، مرحمت اور مواسات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ جذبات اور بنیادی صفات ان کے اندر موجود نہ ہوں تو ظاہری طور طریقوں کی کوئی یکسانی اور ہم رنگی انھیں متحد نہیں رکھ سکتی جب کہ اُن کے موجود ہونے کی شکل میں ظاہر کی کوئی بھی رنگارنگی اُنھیں اختلاف اور تفرقے کا شکار نہیں بنا سکتی۔ شخصی قوانین کا تعلق انسان کے ظاہری احوال ہی سے ہے، نہ کہ مذکورہ داخلی کیفیات اور جذبات سے۔ اِس لئے قومی اور ملکی اتحاد کے لیے ان قوانین کی یکسانی (یونیفارم سول کوڈ) کو ناگزیر ٹھیرانا نری سطح بینی کی بات ہے۔ اہلِ مُلک کا طرزِ فکر اور طرزِ عمل اگر اخلاقی اور حق پسندانہ ہو تو ملک کے اندر ایک دو نہیں، دس طرح

کے شخصی قوانین کا نفاذ بھی قومی اتحاد کی راہ میں کوئی دشواری نہیں پیدا کر سکتا۔ اس کے بخلاف اگر یہ صفات ان کے اندر ناپید یا کم یاب ہوں تو یکساں سول کوڈ جیسی ہزار عطائی تدبیریں بھی جسدِ قومی میں الفت اور یگانگی کی روح نہیں دوڑا سکتیں۔ چنانچہ کتنی ہی قوموں کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اگر چہ ان میں سے ہر ایک کا پرسنل لا یکساں نوعیت ہی کا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ متحد نہ رہ سکیں، اور ایک ایک قوم بکھر کر دو دو، تین تین قوموں کی شکل اختیار کر گئی۔ ایسا صرف اس لئے ہوا کہ اس کے نکاح اور طلاق، وراثت اور وصیت کے ضابطے تو ضرور یکساں اور مشترک تھے، مگر افرادِ قوم کے دل باہمی اخلاص اور تعاون، حقوق شناسی اور بھائی چارگی کے جذبات سے خالی ہو گئے تھے، اور جب اس حقیقی وجہِ اتحاد کی عدم موجودگی کا منطقی نتیجہ، تفرقہ و انتشار کی شکل میں، ظاہر ہونے لگا تو سول کوڈ اور پینل کوڈ کی یکسانی ایک لمحہ کے لئے بھی اُسے نہ روک سکی۔ یہ اس اَمر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ شخصی قوانین کی یکسانی کو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کی حیثیت ایوانِ اتحاد کے ظاہری نقش و نگار کی سی ہے، اس کی بُنیاد یا دیوار یا چھت کی سی ہرگز نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عمارت کی بقا نقش و نگار پر ذرا بھی موقوف نہیں ہوتی۔

یہ تو قومی اتحاد کے لئے یکساں سول کوڈ کو ناگزیر قرار دیے جانے کے دعوے کا حال تھا۔ اب جہاں تک اِس قسم کے اتحاد کے معقول اور منصفانہ ہونے کا سوال ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ اُسے معقول اور منصفانہ اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب معقولیت اور انصاف کو نامعقولیت اور ناانصافی کے ہم معنی بنا دیا جائے۔ اِس اتحاد کی خاطر مسلمانوں کے بھی شخصی قوانین کو منسوخ

کیا جائے گا۔ جب کہ ان قوانین کی حیثیت نہ مجرد قوانین کی ہے نہ وضعی قوانین کی، بلکہ اعلیٰ اسلامی اقدار کے حامل اور خالص دینی قوانین کی ہے۔ مسلمان انھیں اپنے دین کا ایک جزو مانتے ہیں، اور اس لئے مانتے ہیں کہ وہ فی الواقع ایسے ہیں ہی۔ چنانچہ کوئی بھی شخص انھیں قرآن کریم اور احادیث میں مذکور دیکھ سکتا ہے۔ پھر ان کی ملّی شخصیت کا دار و مدار بھی بہت بڑی حد تک اِنہی قوانین کے وجود و نفاذ پر ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر ان قوانین کا احترام دراصل مسلمانوں کے دین کا احترام، اور ان کی منسوخی دراصل اس دین کے ایک اہم حصّے کی منسوخی ہے، دوسری طرف اُن کی ملّی انفرادیت کا قتل بھی ہے۔ اب فیصلہ کیجئے کہ ایک جمہوری ملک میں، جس نے بنیادی حقوقِ انسانی کے بین الاقوامی چارٹر پر دستخط بھی کر رکھے ہوں، مسلمانوں کے شخصی قوانین کی منسوخی کا اقدام جمہوریت اور انصاف کا اقدام کیسے کہا جا سکے گا؟ سات کروڑ کی عظیم آبادی کو اُس کے اپنے ملّی تشخص سے محروم کر دینا اور اس سے اپنے شرعی قوانین کی عملی پیروی کر سکنے کے بنیادی حق کو چھین لینا تو بہر حال میں بدترین قسم کی نامعقولیت اور کھلا ہوا استبداد ہی کہا جائے گا۔

پھر سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اگر مختلف قسم کے شخصی قوانین قومی اتحاد کی راہ کا روڑا بن سکتے ہیں تو مختلف دینی عقائد، مختلف طریقہائے عبادت، اور مختلف اخلاقی تصورات بدرجۂ اولیٰ بن سکتے ہیں۔ کیونکہ ذہن کے سانچے بنانے اور زندگی کے عملی رویّے متعین کرنے میں عقائد اور تصورات ہی کا رول بنیادی اور فیصلہ کن ہوا کرتا ہے۔ اور یہ انسانی ذہن کا سانچہ ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو اتحاد پسند یا افتراق پرست بنایا کرتی ہے۔ تو کیا اِس مزعومہ اتحادِ قومی کے لئے

یکساں دینی عقائد اور مشترکہ طریقِ عبادت کا بھی قانون بنایا جائے گا؟ اگر نہیں، تو پھر یکساں سِول کوڈ کی تجویز میں کیا معقولیت رہ جاتی ہے۔[۱]

(۲) جہاں تک اِس سوال کا تعلق ہے کہ کیا یکساں سول کوڈ کے نتیجے میں قومی اتحاد کا مقصد فی الواقع حاصل بھی ہو جائے گا، تو اس کا جواب بھی اثبات میں نہ ہوگا۔ کیونکہ یکساں سِول کوڈ مختلف فرقوں پر ایک طرح کی معاشرتی ہم رنگی کا پردہ تو ضرور ڈال دے گا، مگر اس کے نتیجہ میں ان کے قلب و ذہن بھی قریب

---

[۱] سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یکساں سِول کوڈ کا نفاذ نہ معقول اور منصفانہ اقدام ہے نہ قومی اتحاد کے لئے ضروری ہے تو پھر جو لوگ اِس پر مسلسل اصرار کر رہے ہیں وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اتنی صاف اور واضح حقیقتوں کا ادراک اُن کے لئے واقعی دشوار اور ناممکن ہو رہا ہے جنھیں اِس تجویز اور اس دعوے کی تردید میں اوپر بیان کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ قرائن ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور قرائن یہ کہتے ہیں کہ یہ تجویز مذکورہ بالا حقائق کو اچھی طرح جاننے پہچاننے کے باوجود پیش کی گئی ہے۔ کیونکہ ایسے دانشور اور ارباب فہم اِس بارے میں اتنے بے دانش اور کم فہم ثابت ہوں، یہ کسی طرح سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ یہ دراصل مغربی تہذیب اور مادّی فلسفۂ حیات پر ان کے ایمان لانے کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے اِس ایمان کے جوش میں لوگوں کے دینی اور ملّی احساسات کو سمجھنے اور عملاً ان کا احترام ملحوظ رکھنے کے قابل ہی نہیں رہ گئے ہیں۔ بلکہ شاید اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ نفسِ مذہب ہی کے مخالف بن گئے ہیں جس کے بعد قدرتی طور پر ان کا اندازِ فکر یہ ہو ہی جانا چاہیے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مذہب کو دُنیا بدر نہ کر دیا جائے۔ اِس بات کا ثبوت، کہ یکساں سِول کوڈ کی تجویز اور اس پر اصرار اسی مذہب مخالف ذہنیت کا کرشمہ ہے، اِس حقیقت سے بھی ملتا ہے کہ خود غیر مسلم اہلِ فکر میں بھی جو لوگ مذہب پسند اور دین شناس ہیں، وہ یکساں سِول کوڈ کے مخالف ہیں، اور اُسے اِنسانی فطرت کے خلاف، اور انصاف سے بعید قرار دیتے ہیں۔ اِس سلسلے میں (باقی حاشیہ برصفحہ ۲۲)

آجائیں گے، ایسا سمجھنا سادہ لوحی کی بات ہوگی۔ خصوصاً مسلمانوں کی حد تک تو اتحاد کے اس نسخے کا غیر مفید ہی نہیں مضر اور مہلک ثابت ہونا یقینی ہے۔ آپ اُن کے دینی احکام کی پیروی سے انھیں جبراً روک دیں، اُن کی ملی انفرادیت کی شہ رگ پر تیشہ چلا دیں، اُن کی کتنی ہی بنیادی قدروں کو پامال کر دیں، انھیں عقیدہ و عمل کے تضاد کی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیں، اور پھر توقع یہ رکھیں کہ یہ اقدامات ان کے اندر ملکی اتحاد و یک جہتی کا ولولہ پیدا کر دیں گے! غور کیجئے انسانی نفسیات کو دیکھتے ہوئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) سب سے اہم مثال آر، ایس، ایس کے سربراہ گرو گولوالکر صاحب کی ہے اُنہوں نے روزنامہ مدرلینڈ کے نامہ نگار سے ایک انٹرویو کے دوران میں فرمایا کہ :۔

"قومیت کے جذبے کو تقویت دینے کے لئے یکساں سول کوڈ کوئی ضروری نہیں ہے.....

جہاں تک یکسانیت کا تعلق ہے میرے خیال میں وہ اندرونِ ملک اتحاد کو مضبوط بنانے کے لئے لازمی نہیں ہے..... اتحاد کے لئے ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہم آہنگی ہے، یکسانیت نہیں ہے.... فطرت ضرورت سے زیادہ یکسانیت سے کراہت کرتی ہے..

..... کوئی بات اس وجہ سے پسندیدہ نہیں ہو سکتی کہ وہ دستور میں درج ہے.....

یکسانیت قوموں میں خطرے کی گھنٹی ہے.... میں تمام طریقہائے زندگی کے تحفظ کا مکمل طور سے حامی ہوں۔" (مدرلینڈ ۲۳ اگست ۱۹۷۲ء)

دوسری شہادت رام راج پریشد کے بانی صدر سوامی کرپاتری جی کی ہے۔ انہوں نے بنارس کے ایک جلسۂ عام میں اعلان کیا کہ :۔

میں پورے ملک کے لئے یکساں سول کوڈ کے مطالبے سے متفق نہیں ہوں۔ مسلمان یا کسی بھی گروہ کے مذہبی امور اور شادی بیاہ کی رسوم میں مداخلت مناسب نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱ پر)

یہ کتنی عجیب توقع ہوگی ؟ مسلمان اپنے دین سے ، اپنی ملیّت سے اور اپنی دینی و اخلاقی اقدار سے، اِس گئی گذری حالت میں بھی ، اتنا لگاؤ بہر حال رکھتے ہیں کہ اپنے دین اور ملّی تشخص پر ایسا کاری حملہ ہرگز برداشت نہ کریں گے ۔ اگر مجبوری کے باعث اِس حملہ کو وہ روک نہ سکے تو ان کے دِل تو کسی حال میں بھی اُس کے آگے ہتھیار نہ ڈالیں گے اور نفرت سے برابر کھولتے ہی رہیں گے ۔ کیا اِس صُورتِ حال کا پیدا کر دیا جانا، جس کے پیدا ہو رہنے میں ہرگز کوئی شُبہ نہیں ، قومی اِتحاد کے مقصد کی خدمت ہوگی ، یا اس کے ساتھ کُھلی ہوئی دشمنی ہوگی ! غرض حقیقت اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اگر یکساں سِول کوڈ کی تجویز نافذ کر دی جاتی ہے تو وہ مُسلم پرسنل لا کے ساتھ مُسلمانوں کے جذبۂ خیر سگالی کو بھی آگ دِکھا دے گی ۔ جس کے بعد قومی یک جہتی کی آرزو آرزو ہی رہ جائے گی ۔ اِس لئے ہوش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ خود صحیح قومی اتحاد کی بقا و ترقی ہی کے مفاد میں یکساں سِول کوڈ کا خیال ترک کر دیا جائے ۔ اِلّا آنکہ ذہن میں مُدعا اور نقشۂ کار وہ ہو جو روس اور چین میں اختیار کیا جا چکا ہے ! لیکن ظاہر ہے یہاں یہ اُسی وقت ممکن العمل ہو سکے گا جب جمہوریت ، سماجی عدل ، بنیادی اِنسانی حقوق ، ضمیر اور مذہب کی آزادی کی وہ دفعات اور لسانی ، نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ۲۲) ہندوؤں اور مُسلمانوں کو اپنے اپنے دھارمک اُصولوں پر چلنا چاہئے ۔ جو مُسلمان اپنے قُرآن اور جو ہندو اپنے ویدوں اور شاستروں پر یقین نہیں رکھتے وہ مُلک کے آئین کا بھی پاس و احترام نہیں کر سکتے ۔ مذہبی آزادی ، مذہب پر عمل اور رواداری کی راہ پر چلنے سے ہی اِنسانی سماج کا بھلا ہو سکتا ہے ۔" (بحوالہ دعوت دہلی مؤرخہ ۲۹ ستمبر ۷۲ء)

- وہ مخصوص دستوری تحفظات کالعدم کر دیئے جائیں جو آئینِ مملکت میں درج ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اِس طرح جو قومی اتحاد وجود میں آئے گا وہ فی الاصل ایک طرح کا جبری انضمام ہو گا، نہ کہ وہ اتحاد جسے جمہوریت کی زبان میں اتحاد کہا جاتا ہے۔

(۳) اب آخری نکتے، خارجی مصالح کی بات کو لیجئے۔ مغربی دُنیا ہمارے ملکی اتحاد کو پسند کرے یا نہ کرے، لیکن وہ اِس بات کو ضرور خوش آمدید کہے گی کہ آخر اس مُلک میں بھی سِول کوڈ نافذ ہو گیا۔ کیونکہ یہ بات مذہب، رُوحانیت اور اخلاقی اقدار کے پیرو ہندوستان کی، ایک گونہ، مذہبیت سے مادیت کی طرف مراجعت ہوگی، جسے وہ خود مدت ہوئی اختیار کر چکی ہے۔ لیکن مُسلم ممالک کے مُسلمانوں پر اس کا ردِ عمل یقیناً دوسرا ہو گا۔ وہ اس اقدام کو ہندوستان کی حکومت ہی کی طرف سے نہیں، یہاں کی ہندو اکثریت کی طرف سے بھی ہندی مُسلمانوں کے دین اور اُن کی ملیت پر کُھلا ہوا حملہ، اور اُن کی تہذیب کُشی قرار دیں گے۔ اِس ضمن میں اُن مُسلمان آمروں کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے، جنھوں نے اپنی مغرب کیشی کے جنون پر اسلامی قوانینِ شخصی کو جزءاً یا کُلاً قربان کر دیا ہے۔ یہ آمر اپنے مُلک کے حاکم ضرور تھے۔ یا ضرور ہیں، لیکن ساری دُنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے عوام کے نمائندے نہیں تھے، یا نہیں ہیں۔ اِس لیے اُن کے اقدامات کو ان کی پسند و ناپسند کا عکاس سمجھنا قریب قریب ایسا ہی ہے جیسے رہوڈیشیا کے سفید فام حکمراں، اسمتھ کو وہاں کی افریقی اکثریت کی مرضیات کا ترجمان سمجھ لیا جائے! غرض ہو سکتا ہے کہ بعض مُسلمان حکام اِن مُسلم پرسنل لا کی منسوخی سے کوئی ناگواری محسوس نہ کریں لیکن ان ممالک کے اصل حاکموں مُسلم عوام — پر اس کا انتہائی خراب اثر پڑے

بغیر نہ رہے گا۔ اور ایک حقیقت شناس و دُور اندیش اِنسان کے لئے اصل اہمیت اُن مُتذبذب حاکموں کی پسند و ناپسند کی ہرگز نہ ہونی چاہیئے جو آج ہیں اور کل کسی اِنقلابِ روزگار کی نذر ہو جا سکتے ہیں، بلکہ ان لاکھوں کروڑوں عوام ہی کی پسند و ناپسند کی ہونی چاہیئے جو ہمیشہ رہیں گے۔

سیکولرزم کے تقاضے کی حقیقت

جہاں تک سیکولرزم کے دستوری تقاضے کا معاملہ ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ دستور ہند میں سب کچھ ہونے کے باوجود سیکولرزم، کا لفظ اور اُس کی اصطلاح بہر حال موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی۔ اِس وجہ کا سُراغ لگانے کے لئے ہمیں خود سیکولرزم کے مفہوم و مُدّعا کو سمجھنا ہو گا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ سیکولرزم کا کوئی ایک متعین مفہوم نہیں ہے، نہ اس کا کوئی متفقہ دائرۂ اثر و عمل ہے۔ اِس کے ایک سے زائد مفہوم بتائے جاتے، اور متعدد تعبیریں بیان کی جاتی ہیں جن میں سے ایک مفہوم اور تعبیر بلاشُبہ وہ بھی ہے جس کی رُو سے کِسی فرقے اور مِلّت کے علیحدہ پرسنل لا کا مقدمہ قابلِ سماعت نہیں رہ جاتا اور پورے مُلک کے لئے یکساں سِول کوڈ کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ لیکن دوسرا مفہوم اور تعبیر اس کے برعکس بھی ہے جس کی رُو سے مختلف مِلّتوں کے علیحدہ علیحدہ شخصی قوانین کے نفاذ میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ روس، چین اور بہت سے مغربی ممالک میں اگر پہلی قسم کا سیکولرزم نافذ ہے تو شام اور بنگلہ دیش جیسے مُسلم اکثریتی مُلکوں ہی میں نہیں، یوگوسلاویہ جیسے مُسلم اقلیتی اور کمیونسٹ مُلک میں بھی دوسری قسم کا سیکولرزم رائج ہے اور وہاں مُسلمانوں کے لئے اُن کا اپنا الگ پرسنل لا نافذ ہے۔ جب حقیقتِ واقعہ

یہ ہے ، اور سیکولرزم کی کوئی ایک ہی نہیں بلکہ مختلف تعبیریں اختیار کی گئی ہیں، تو کسی بھی ملک کے لئے اِن میں سے اُسی تعبیر کا اپنانا معقول کہا جا سکے گا جو اس کے اپنے حالات اور مصالح کے مطابق ہو۔ ہندوستان کے حالات اور مصالح سب کے سامنے ہیں۔ اُن کے بارے میں یہ دعوےٰ کرنا کہ وہ سیکولرزم کی پہلی تعبیر سے ہم آہنگی رکھتے ہیں، راستی اور حق پسندی کا خون کرنا ہے۔ اِس لئے یہاں سیکولرزم کے اختیار کئے جانے کے معنی ہرگز یہ نہ ہونے چاہئیں کہ اس کی مختلف تعبیروں میں سے چھانٹ کر اسی تعبیر پر اصرار کیا جائے جو انتہا پسندانہ اور جارحانہ قسم کی ہو، اور پھر یہ سمجھتے ہوئے کہ سیکولرزم پر 'ایمان' رکھنے کے باوجود کسی مسلم پرسنل لا یا ہندو پرسنل لا کو باقی رہنے کی اجازت دینا اس 'ایمان' کی نگاہ میں 'ارتکابِ کفر' کی بات ہوگی، یہاں آنکھ بند کر کے یونیفارم سول کوڈ کا رولر چلا دیا جائے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے استوائی علاقوں کے بارے میں بھی لباس اور تن پوشی کا ٹھیک وہی مفہوم لیا جائے جو قطبی علاقوں کے لئے ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اگرچہ لباس سبھی انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت ہے، لیکن اس کا عملی مفہوم سب کے لئے ایک نہیں ہوتا۔ اور پوری نوعِ انسانی ایک ہی طرح کا لباس نہیں پہنتی۔ بلکہ ہر خطّے کے رہنے والے ویسے ہی باریک یا موٹے، ٹھنڈے یا گرم، کم یا زیادہ کپڑے پہنتے ہیں جو اُن کے اپنے موسمی حالات، اپنے ماحول اور آب و ہوا کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سیکولرزم کو ملک کی ناگزیر ضرورت سمجھنے کے باوجود معقولیت پسندی، جمہوریت، مصلحت بینی اور ہوش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ اس

کے عملی مفہوم کی تعیین یہاں کے حالات اور حقائق کو سامنے رکھ کر ہی کی جائے۔ جب یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ مختلف فرقوں کے لئے مشترکہ سول کوڈ سیکولرزم کا کوئی لازمی تقاضا نہیں ہے، اور اس کے بغیر بھی ملک اور سماج سیکولر بن سکتا اور رہ سکتا ہے، (جیساکہ یونان اور یوگوسلاویہ، بنگلہ دیش اور شام جیسے ممالک کی مثال سامنے موجود ہے) دوسری طرف یہاں کے مختلف فرقوں میں سے کم ازکم مسلمانوں کے لئے اُن کے اپنے پرسنل لا کی اتنی اور ایسی اہمیت ہے جس سے زیادہ کسی اہمیت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اُن کے دین کا بھی ایک اہم جزو ہے اور اُن کی ملّی انفرادیت بھی بڑی حد تک اسی کے اتباع پر موقوف ہے۔ ایسی حالت میں حقیقت پسندی اور معقولیت سے یکسر بعید ہی ہوگا اگر یہاں روسی اور چینی برانڈ کا سیکولرزم مُسلط کر دیا جائے، اور پھر یکساں سول کوڈ کو اس کا ایک ناگزیر مطالبہ قرار دے کر مختلف ملّتوں کے شخصی قوانین کو ختم کر کے رکھ دیا جائے، اور اس کی مطلق پروا نہ کی جائے کہ اس اندھا دھند اقدام کے نتیجے میں باشندگانِ ملک پر کیا بیت جائے گی، اور یہ ملک کے بھی واقعی مفاد میں ہوگا یا نہیں۔

دقیانوسیت کا حقیقت ناپسندانہ الزام اب یکساں سول کوڈ کے آخری مقصد یا محرک کو لیجئے۔ دوسرے فرقوں کے شخصی قوانین پر ظلمت، اور 'دقیانوسیت' کا الزام عائد ہوتا ہے یا نہیں، اس بارے میں یہ فرقے ہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کے شخصی قوانین کا تعلق ہے، ہم اس الزام کو بہتان، یا کم ازکم انتہائی ناواقفیت قرار

دیتے ہیں۔ جو شخص بھی اِن قوانین کا، بالخصوص اُن کی بنیادی اور منصوص دفعات کا، گہرائی میں اتر کر، تفصیلی جائزہ لے گا اُسے صاف دِکھائی دے گا کہ یہ قوانین نہ تو کسی مخصوص ماحول اور تمدنی حالات کی پیداوار ہیں نہ اُن پر مکان وزمان کی کوئی چھاپ ہے، اور نہ ایسا ہے کہ وہ اپنے پیچھے کوئی اہم اخلاقی مقصد یا معاشرتی مصلحت نہ رکھتے ہوں۔ اس کے بخلاف وہ ٹھیک اِنسانی فطرت، مُسلّمہ اخلاقی اقدار، اعلیٰ معاشرتی مصالح اور اہم اجتماعی مقاصد کے حامل قوانین ہیں۔ حالات کے تغیر اور تمدّن کے ارتقا سے زندگی کے مسائل میں تبدیلی اور وسعت یقیناً آئی ہے اور برابر آتی رہے گی۔ لیکن یہ تبدیلی اور وسعت مسائل کے صِرف ظاہر اور اُن کے 'قالب' میں ہوتی ہے، اُن بُنیادی عوامل میں نہیں ہوتی جن سے مسائل پیدا ہوتے ہیں، اور نہ اُن مقاصد اور مفادات میں ہوتی ہے جن کا حصول ان مسائل کے حل سے مطلوب ہوا کرتا ہے۔ اِنسانیت کی حُرمت، اخلاق کا تحفظ، نسلِ اِنسانی کی بقا، خاندان کا استحکام، عائلی زندگی کا سکون، زوجین کے حقوق اور فرائض کی حقیقت پسندانہ اور منصفانہ تعیین اور اُن کی ضمانت، خوُن کے رشتے کا احترام، اہلِ قرابت کے حقوق کا پاس، کم زور طبقات خصوصاً یتیموں اور عورتوں کے مفاد کی حفاظت، معاشرے میں باہمی تعاون اور ایثار وہمدردی کا فروغ ــ وغیرہ وہ اُصول ومقاصد ہیں جو انسان کو ہمیشہ محبوب رہے ہیں، اور جب تک وہ حیوان کے ذہن ودماغ سے نہ سوچنے لگے انھیں محبوب ہی رکھے گا۔ کیونکہ یہ اُس کی فطرت کی طلب، اور اس کی انسانیت کا لازمہ ہیں۔ اِسلام کے شخصی قوانین اِنہی مُسلّمہ اُصول

ومقاصد کو سامنے رکھ کر وضع فرمائے گئے ہیں۔ اِس لئے اُنہیں بنیادی طور پر ہر زمانے اور ہر جگہ مُناسب، حسبِ ضرورت، اور وقت کے مُطابق ہی پایا جائے گا، اور زندگی کے مَسائل کا حَل مُہیا کرنے میں اُن کی ناکامی کا کوئی سوال نہ پیدا ہو گا۔ نئے حَالات میں، اور نئے مَسائل کے حل کے لئے، ضرورت جس بات کی ہوگی وہ صرف صحیح اور صَالح اِجتہاد کی ہوگی جس سے کام لے کر ہر نئے مسئلے اور ہر نئی صورتِ حال موزوں حل نکالا جاتا رہے گا۔ جس کی کہ اسلام نے ہدایت بھی دے رکھی ہے اور جس کے مطابق مسلسل عمل بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ حَل، ایک طرف تو مذکورہ بالا اصول اور مقاصد ہی پر مبنی، یعنی لازماً حدودِ شریعت کے اندر ہوگا، دوسری طرف اس میں زمانے کے جدید تقاضوں کا بھی معقول جواب ہوگا۔ اِسلامی قوانینِ شخصی کا یہی خاص وصف ہے جس کی بدولت وہ آج تیرہ چودہ سو برسوں سے پُوری دُنیا میں مُسلمانوں کی عائلی زندگی کو کامیابی کے ساتھ منظم اور مستحکم رکھتے چلے آرہے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ اِدھر کوئی نصف صدی سے بعض مُسلم معاشرے کچھ عائلی اور معاشرتی پیچیدگیوں سے دوچار ہیں، دوسرے لفظوں میں زیرِ بحث قوانین سے اُن کی زندگی کے مَسائل کِسی نہ کِسی حَد تک حَل نہیں ہو پا رہے ہیں۔ لیکن اِس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلامی قوانین میں مَسائل کے حَل کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ یہ ہے کہ خود مُسلمانوں میں اِن قوانین کے صحیح اتباع کی ضروری صلاحیت نہیں رہ گئی ہے۔ یعنی ایک طرف تو موجودہ حکمراں تہذیب کے زیرِ اثر مسلمانوں کی وہ اخلاقی اور دینی رُوح مضمحل ہوگئی ہے جو ان قوانین کے عملی احترام کے لئے از حد ضروری ہے، دوسری طرف بہت سے نئے تمدنی حقائق کا پُوری طرح احساس نہ کر سکنے کے باعث اس اجتہادِ فکر سے پُوری طرح کام نہیں لیا

جا سکا ہے جس کا مطالبہ عملی زندگی کر رہی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ مُسلمانوں کی اپنی عملی اور اجتہادی کوتاہیوں کی ذمہ داری اِسلام اور اُس کے قوانین پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اِسی طرح صورتِ حال کا فطری اور حقیقی تقاضا بھی یہ نہیں ہے کہ ان قوانین ہی کو ختم کر دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ ان اسباب کو دُور کیا جائے جو مُسلمانوں کے موجودہ اخلاقی، دینی اور فکری زوال کے موجب بنے ہیں۔

غرض اسلامی قوانینِ شخصی پر دقیانوسیت اور فرسودگی کا الزام حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اِلّا آنکہ خود اُن اخلاقی اُصولوں، انسانی قدروں اور سماجی مصلحتوں ہی کو دقیانوسی، فرسودہ اور ناقابلِ التفات قرار دے دیا جائے جن پر اِن قوانین کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یکساں سِول کوڈ کے حامیوں اور اسلامی قوانین کو دقیانوسی قرار دینے والوں کے اندازِ فکر کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو حقیقت کچھ یہی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر تعدّدِ ازواج ہی کے مسئلے کو لے لیجئے۔ اِسلام نے عدل کی ناگزیر شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے رکھی ہے، اور جن مصالح کی خاطر یہ اجازت اُس نے دے رکھی ہے ان میں ایک اہم مصلحت معاشرے کو جنسی بے راہ روی کی غلاظت سے محفوظ رکھنا ہے اور یہ اخلاقی پاکیزگی اُس کی نگاہ میں اِتنی غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے جس کی کوئی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اَب اگر کوئی صاحب اخلاقی پاکیزگی اور عفت کو کوئی اہمیت نہ دیں تو ان کے لئے تعدّدِ ازواج کے قانونی جواز کی معقولیت کا سمجھ پانا دشوار ہی ہوگا۔ اس کی ایک کھلی ہوئی شہادت آپ کو پروفیسر آصف فیضی صاحب کے فرمودات میں ملے گی۔ موصوف تعدّدِ ازدواج پر پابندی کی تحسین کرتے ہوئے

اپنے ایک تازہ مضمون میں لکھتے ہیں :۔

ان اسلامی ممالک میں بھی جن میں شہریوں کی اکثریت دینِ اسلام کو مانتی ہے، مغربی تجارتی اور ثقافتی اثرات کے تحت سماجی انقلاب آچکا ہے ..... اور خصوصاً وہاں عورتوں کے حقوق کے معاملے میں خاصا انصاف برتا جانے لگا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں عورت اب صرف شوہر کی مُطیع و فرماں بردار ہی نہیں رہی بلکہ اُس کی مددگار اور رفیق حیات ہے۔ اِس لئے تعدد ازدواج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جنسی بے راہ روی تو ساری دُنیا کا مسئلہ ہے۔ اِس کے باوجود مغربی تہذیب سے جتنے بھی ممالک مُتاثر ہیں اُن میں ایک بیوی رکھنے کی پابندی ہے۔ ان ملکوں نے عورتوں کی حیثیت بہتر بنانے کے لئے قوانین وضع کیے ہیں" الخ

(مُسلم پرسنل لا، از پروفیسر فیضی ص۲۹، ص۳۰)

آپ نے دیکھا کہ پروفیسر صاحب کتنی بے تکلفی کے ساتھ یہ فرماکر کہ "جنسی بے راہ روی تو ساری دُنیا کا مسئلہ ہے" آگے بڑھ گئے ہیں۔ اُن کے کہنے کا صاف مُدعا ہے کہ تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا جانا بہرحال ایک مستحسن اور منصفانہ اور ضروری امر ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اس کے نتیجے میں معاشرے کے اندر جنسی بے راہ روی پھیل جائے گی، تو اِسے کوئی اہمیت نہ دی جانی چاہیے، کیونکہ یہ تو "ساری دُنیا کا مسئلہ ہے"!

غرض حقیقت کچھ یہی معلوم ہوتی ہے کہ مُسلم قوانینِ شخصی پر جو لوگ ظلمت

اور دقیانوسیت کا فتویٰ لگانے پر تلے بیٹھے ہیں وہ یہ فتویٰ اِن قوانین پر نہیں، بلکہ فی الواقع اُن اُصول، اُن اقدار، اور اُن مقاصد پر لگا رہے ہیں جن کے یہ قوانین حامل ہیں۔ اگر ان اقدار اور مقاصد کی اہمیت ان حضرات کی نگاہ میں بھی مُسلّمہ ہوتی تو اُن کی زبان سے اسلامی قوانین کو از کار رفتہ قرار دینے کی بات ہرگز نہ نکلتی۔ آدمی جس قدر اور مقصد کو عزیز رکھتا اور ناگزیر سمجھتا ہے اُس کے حصُول کے قدرتی ذرائع کو بھی ناگزیر ہی سمجھے گا۔ اور یہ دراصل اس کے ذہن اور اندازِ فکر کی بات ہے کہ وہ کِس قدر کو اہمیت دیتا ہے اور کِس کو نہیں۔ جسے اہمیت دے گا اس کے لئے سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار رہے گا، اور جس کی اُس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہوگی اُس کی بات بھی نہ سُننا چاہے گا۔ روس کے نزدیک سب سے بڑی اور مرکزی اہمیت معاشی مسئلہ کو حاصل ہے، اور اخلاقی پاکیزگی کو وہ ایک دقیانوسی خیال سمجھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ داشتہ بازی کو کُھلی چھوٹ دیئے ہوئے ہے، مگر معاشی قوانین اور مفاد پر اگر کوئی آنچ آتی نظر آئے تو اُس کے لئے انتہائی حد تک ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ابھی چند دِنوں کے اندر ہی اس کے یہاں سے دونوں ہی قِسم کی عملی شہادتیں موصول ہوئی ہیں۔ وہاں کے مشہور ادیب، عالمی شہرت رکھنے والی کتاب "کینسر وارڈ" کے مصنف، ڈاکٹر الیگزینڈر سولنسٹن نے اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرلی ہے، اور اب وہ اپنی جس محبوبہ سے شادی کرنے والے ہیں اُس سے اُن کے دو بچے پہلے سے موجود ہیں۔ دوسری طرف اطلاع یہ ہے کہ ایک بینک ملازم کو گزشتہ دس برسوں میں ۱۳۳۱۸۹۲ روبل خُرد بُرد کرنے کے الزام میں سزائے موت

کا حکم دے دیا گیا ہے اور اُس کے کئی ساتھیوں کو تین سے لے کر پندرہ سال تک کے لئے مزدوری کے جبری کیمپوں میں بھیج دیا گیا ہے۔ یہ دونوں ہی خبریں یقیناً اس فلسفۂ حیات اور تصورِ اخلاق کے عین مطابق ہیں جن پر روس ایمان رکھتا ہے۔ عفت کی قدر اُس کے نزدیک کوئی قدر نہیں، معاشی قدر بنیادی اور سب سے اہم قدر ہے۔ اِس لئے کوئی شخص اگر داشتہ رکھتا اور نکاح کے بغیر بچّے پیدا کرتا ہے تو اس پر کوئی قدغن نہیں۔ لیکن اگر خزانے میں خُرد بُرد کرتا ہے تو گردن زدنی ٹھیرتا ہے۔

غرض جس شخص کی نگاہ میں جس قدر کی جتنی کچھ اہمیت ہوتی ہے وہ اتنا ہی اُس کے حامل قوانین کو اہم قرار دیتا ہے۔ اِس لئے جو لوگ اسلامی قوانین کو دقیانوسی ٹھیراتے ہیں، قیاس کہتا ہے کہ وہ دراصل اسلامی اقدار اور اخلاقیات کو دقیانوسی سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو دیانت کا تقاضا ہے کہ بات کُھل کر کہی جائے۔ مگر کون جانے کہ خود یہ ’دیانت‘ بھی ”دقیانوسی قدر“ نہیں قرار دی جا چکی ہے!

مُہلک نتائج

جب یکساں سِول کوڈ کی تجویز کی اصل نظریاتی اساس ہی اسلام کی نظر میں غلط اور باطل ہے، جیسا کہ پچھلے صفحات میں وضاحت سے بتایا جا چکا، اور وہ دین وخدا پرستی کا اس کے مخالف تصور رکھتا ہے، تو بالکل فطری بات ہے کہ اِس تجویز کے دائرۂ نفاذ میں اِسلامی قوانینِ شخصی کو بھی داخل کر دینا کوئی معمولی بات نہ ہو گی، بلکہ مُسلمانوں کے حق میں اُس کے نہایت دُور رس نتائج نکلیں گے۔ معاملے کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اِن نتائج کا ذرا تفصیلی جائزہ لے لیا جائے:-

(۱) عملی حالتِ ارتداد سب سے اہم اور خطرناک نتیجہ تو اِس اقدام کا یہ ہو گا کہ مُسلمان اپنی عائلی اور معاشرتی زندگی میں اپنے دِین کے اتباع سے جبراً محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یکساں سِول کوڈ کی تجویز اُن کے حق میں اِک گونہ عملی ارتداد کی تجویز ثابت ہو گی۔ کیونکہ اُن کے وہ شخصی قوانین، جو اس تجویز کے ایکٹ بن جانے کے بعد لازماً منسوخ ہو جائیں گے، کچھ عام نوعیت کے قوانین نہیں ہیں، بلکہ اُن کی حیثیت خالص دینی احکام کی ہے اور وہ اصلاً اُن کے دین وشریعت کا ایک جزو ہیں، ٹھیک

ویسے ہی جزو جیسے کہ نماز اور زکوٰۃ، روزہ اور حج وغیرہ ہیں۔ اِس لئے ان قوانین کی پابندی، ان کے لئے بہر حال ضروری ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اُن کی ایمانی اور اسلامی زندگی میں زبردست خلا پیدا ہو جائے گا۔ اِس واضح حقیقت کی موجودگی میں اگر انھیں اِن قوانین کی جگہ کسی دوسرے قانون کی پابندی پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور ان سے اُن کا عملی رشتہ کاٹ دیا جاتا ہے تو اس کے معنی عملاً اس کے سوا اور کچھ نہ ہوں گے کہ اُن کی پوری شخصی زندگی پر سے اُن کے دین کے نفاذ کو زبردستی روک دیا گیا۔ آخر اسے مسلمانوں کا ایک گونہ جبری ارتداد نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے!

(۲) اسلامی اقدار کی بیخ کنی

دوسرا نتیجہ اِس تجویز کے نفاذ کا یہ ہوگا کہ مُسلم معاشرے میں کتنی ہی اسلامی اقدار پر سے امان اُٹھ جائے گی اور وہ ایک ایک کر کے اپنا مقام کھوتی چلی جائیں گی۔ یہ اِس لیے کہ یہ اسلام کے شخصی قوانین ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کی بہت سی اعلیٰ قدروں کے محافظ، اور بہت سے اہم مقاصد کے حصول کا ذریعہ بھی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ قوانین اِنہی اغراض و مقاصد کی خاطر وضع فرمائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر نکاح کے احکام سے دوسرے مقاصد کے علاوہ ایمان اور اخلاق کی حفاظت بھی مقصود ہے۔ طلاق اور خلع کے قوانین کا مُدّعا یہ ہے کہ ایسے ازدواجی بندھن سے جو اپنے مطلوبہ مقاصد کو پورا نہ کر رہا ہو اور خیر کے بجائے شر کا باعث بن رہا ہو، حدود اللہ پامال ہو رہی ہوں اور ازدواجی زندگی تلخیوں سے بھر گئی ہو، زوجین میں سے ہر ایک کے لئے گلو خلاصی کی ایک ایک مناسب اور باوقار سبیل مُہیا رہے،

تاکہ بوقت ضرورت وہ اپنی خانگی زندگی کو تلخ کامیوں سے، اور حدود اللہ کو پامالیوں سے بچا سکیں۔ اسی طرح وراثت کے قانون کا منشا یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں صلہ رحمی کی بنیادی انسانی قدر کو قرار واقعی مقام حاصل رہے خون کے رشتے کو عملی احترام اور خاندانی رابطے کو استحکام میسر ہو، اس کے علاوہ معاشرے کے کم زور طبقوں، بالخصوص یتیموں اور عورتوں کے حقوق، ترکے میں، متعین اور محفوظ رہیں، نیز دولت کے مسلسل پھیلاؤ سے ذرائع معاش زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچتے رہیں۔ انہی چند مثالوں پر دوسرے قوانین کو بھی قیاس کر لیجئے، پھر اندازہ لگائیے کہ اگر ان قوانین کو یکساں سول کوڈ پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے تو اس کیا کچھ نتائج نکلیں گے؟ کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ ایسی صورت میں ان قوانین کی اپنی مخصوص وضع و ہیئت ہی ختم نہ ہو جائے گی بلکہ اُن کے ساتھ ساتھ کتنی ہی اسلامی قدریں اور مصلحتیں بھی فنا کے گھاٹ اُتر جائیں گی، یا کم از کم یہ کہ اُن کا حال کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ کیونکہ ان قوانین کی اصل (قرآن اور سُنت) کو رد کر دیئے جانے کے بعد اُن کے مقاصد و مصالح کے بدستور برقرار رہ سکنے کا خیال ایسا ہی خام اور بے تکا ہے جیسے جمہوریت یا اشتراکیت کے بنیادی نظریے اور فلسفے کی نفی کر دینے کے باوجود یہ توقع رکھی جائے کہ اس کے سیاسی اور معاشی اُصول و مقاصد بدستور کارفرما رہیں گے غرض اسلامی قوانین شخصی کا خاتمہ نتیجہ کے اعتبار سے بہت سی اسلامی قدروں اور اُصولوں کا بھی خاتمہ ہوگا۔ اور اسلامی قدروں اور اُصولوں کے خاتمے کے جو معنی ہیں وہ کسی صاحبِ نظر پر مخفی نہیں ہو سکتے۔

(۳) ذہنی کشاکش کی مار تیسرا نتیجہ اس تجویز کے نفاذ کا یہ نکلے گا کہ مسلمان سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو رہیں گے، اور اُن کی زندگی مستقل طور پر تضادات کے بھنور میں ہچکولے کھاتی رہے گی۔ اُن کا عقیدہ تو یہ ہوگا کہ اسلام نے اُن کے عائلی اور معاشرتی معاملات کے لئے جو احکام دیئے ہیں وہی حق ہیں اور اُن کی زندگی پر اُن کا نفاذ اِن کے دین و ایمان کا بُنیادی تقاضا ہے، اُن کے بجائے اگر کسی اور قانون اور ضابطے کے تحت انھوں نے اپنے یہ معاملے انجام دیئے تو وہ ازروئے حقیقت کالعدم ہی رہیں گے۔ مگر عملی طور پر وہ اپنے معاملات اِن احکامِ شریعت کے تحت انجام نہ دینے کے لئے مجبور کر دیئے گئے ہوں گے، اور کوئی اور ہی مجموعۂ قوانین اُن پر نافذ ہو کر اِن معاملات کو منضبط کر رہا ہوگا، جو قرآن اور سُنّت کو سند اور مرجع مان کر نہیں خالص، سماجی بُنیادوں پر، اور خُدا کی طرف سے نہیں بلکہ کچھ انسانوں کی طرف سے وضع کیا گیا ہوگا۔ غور کیجئے ایسی حالت میں مُسلمان غریب کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوگی؟ وہ کس ذہنی عذاب میں مُبتلا کر دیا گیا ہوگا؟ اُس کا ایمان اور عقیدہ اسے کسی اور طرف جانے کے لئے کہہ رہا ہوگا۔ لیکن اس کے گلے میں پڑی ہوئی قانونِ مُلکی کی آہنی زنجیر اُسے کسی اور طرف کھینچ کرلے جا رہی ہوگی۔ وہ جس بات کو حق باور کر رہا ہوگا قانونِ وقت اُسے باطل ٹھیرا چکا ہوگا، اور جس اَمر کو وہ باطل اور حرام یقین کر رہا ہوگا قانون اُسے جائز اور واجب الاتباع قرار دے چکا ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنی بیوی کو بطورِ خود طلاق دیتا ہے، جیسا کہ اسلامی قانون کی رُو سے اُسے اس کا اختیار حاصل ہے۔ یہ

طلاق قانونی اور دینی ہر حیثیت سے واقع ہو جائے گی ، اور اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے حلال نہ رہ جائے گی ۔ اب اگر ملک کا سول کوڈ طلاق کے لئے عدالت کی اجازت یا اس کی وساطت کو شرط قرار دے دیتا ہے ، اور اس اجازت یا وساطت کے بغیر ، بطور خود دی ہوئی طلاق کو غیر مؤثر ٹھیرا دیتا ہے[1] ، تو اندازہ کیجئے کہ کیسی عجیب صورتِ حال پیدا ہو رہی گی !! اسلام کے قانون اور فیصلے کی رُو سے تو طلاق واقع ہو چکی ہوگی ، عدت گزر جانے کے بعد عورت سے شوہر کا ارتباط حرام اور زنا کے حکم میں ہو چکا ہو گا ، اب وہ ایک دوسرے کے وارث بھی نہ ہو سکیں گے ۔ مگر نافذ الوقت قانونِ ملکی دونوں کو زبردستی باندھے رکھے گا ، اگر اُن کے اولاد ہو جاتی ہے تو اُسے جائز اولاد قرار دے گا ، اُنھیں ایک دوسرے کا ترکہ دِلائے گا ۔ اِسی طرح اگر ایک غیر مُسلم مُسلمان ، یا ایک مُسلمان مُرتد ہو جاتا ہے ، مگر اُس کی بیوی بدستور اپنے مذہب پر قائم رہتی ہے ، از رُوے شرع اب نہ اُن دونوں کا نکاح باقی رہ سکتا ہے نہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں ۔ مگر یکساں سول کوڈ کہہ سکتا ہے کہ مذہب کا اختلاف ازدواجی رشتے کے باب میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا ، اِس لئے زوجین میں سے ایک کے مذہب بدل لینے سے اُن کے

---

[1] چنانچہ ہندو کوڈ (ہندو میرج ایکٹ) میں ، جسے ہماری پارلیمنٹ نے چند سال قبل وضع کر کے نافذ کیا ہے ، طلاق کا قانون ایسا ہی بنایا گیا ہے ۔ اس لئے اگر یکساں سول کوڈ بنتا ہے تو اس میں طلاق کے لئے ایسا ہی قانون بننا تقریبًا یقینی سمجھنا چاہیئے ۔

ازدواجی رشتے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اب مسلمان فریق مجبور ہوگا کہ ایک غیر مسلم کو بدستور اپنا شریکِ حیات بنائے رکھے، اور اپنے ایمان، اپنے دین کے حکم کی صریح خلاف ورزی کرتا رہے، حتیٰ کہ حرام کاری تک سے اپنے کو نہ بچا سکے۔ ایک تیسری مثال لیجئے۔ ایک شخص معقول وجوہ کی بنا پر ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرتا ہے۔ مُلک کا سِول کوڈ اس نکاح کو غیر قانونی اور کالعدم قرار دے کر دوسری عورت کو اس سے علیحدہ اور غیر متعلق رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اب یا تو وہ غریب زندگی بھر تنہائی کی مصیبت میں مُبتلا رہے، یا کسی اور سے نکاح کر کے حرام کاری کی مُرتکب ہوتی رہے۔

یہ تو ان معاملات کی مثالیں تھیں جن میں مُسلمانوں کو اپنے ایمان اور عقیدے کی رُو سے فعلِ حرام تک کا ارتکاب کرنا لازم آ جا سکتا ہے۔ اب بعض مثالیں دوسری طرح کی لیجئے، جن کا تعلق عفت و اخلاق سے نہیں بلکہ حقوق سے ہے۔ اِسلام نے وِراثت کی بنائے اِستحقاق اور مستحقینِ وِراثت کے حِصّے قطعیت سے متعین کر دیئے ہیں، جن کے مطابق ترکے کی تقسیم دِینی طور پر فرض ہے۔ اندیشہ ہی نہیں یقین[۱] ہے کہ یکساں سِول کوڈ بننے کے بعد نہ یہ

---

[۱] اِس یقین کی وجہ بجائے خود بھی بالکل عیاں ہے، عملی شہادت کے لئے ہندو قانونِ وراثت (ہندو سیکشن ایکٹ) ۱۹۵۶ء بھی موجود ہے جس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے حصے وراثت میں برابر کر دیئے گئے ہیں، اور اولاد کی موجودگی میں ماں کو تو وراثت کا مستحق قرار دیا گیا ہے مگر باپ کو محروم ٹھیرا دیا گیا ہے۔ اِسی طرح اور بھی بہت سی کیا تقریباً سبھی دفعات اِس قانون کی،

بنائے اِستحقاق بعینہٖ برقرار رہ جائے گی نہ مُستحقین کے حصّوں کی یہ مقدار۔ کتنے ہی حق داروں کو غیر مستحق ٹھیرا دیا جائے گا، اور کتنے ہی حق داروں کے حصے کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے۔ اب ایک مُسلمان کے ترکے کی تقسیم اگر اس کوڈ کے مطابق ہوتی ہے، تو سوچیے شریعت کے نقطۂ نگاہ سے کتنی حق تلفیاں اور غلط بخشیاں وجود میں آجائیں گی، اور خود ورثہ اپنے دین کے احکام کو پسِ پشت ڈال دینے کی کیسی ذہنی اذیت سے دو چار ہوں گے؟ ایک اور مثال مطلقہ کے نان نفقے کی لیجیے۔ اسلام نے اسے شوہر کے مال میں سے صِرف عدّت کے زمانے تک کے مصارفِ زندگی اَدا کرنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن یکساں سِول کوڈ لازم قرار دے سکتا ہے کہ یہ مصارف اُسے زندگی بھر یا عقدِ ثانی تک دینے ہوں گے[۱]۔ قطع نظر اس بات سے کہ یہ انصاف کے خلاف اور شوہر پر بلا وجہ تاوان اور غیر معمولی ظلم ہے، وہ اگرچہ اِس قانون کے خلاف دَم نہ مار سکے گا، لیکن حال یہ ہوگا کہ ایک طرف وہ اِس پر عمل کر رہا ہوگا دوسری طرف خود غرضی اور نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ عین اپنے دینی احکام یعنی اپنے ایمان و اُصول کی بنا پر اُسے ظلم بھی یقین کر رہا ہوگا۔

اِن چند مثالوں سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ یکساں سِول کوڈ کی لٹکتی ہوئی تلوار اگر چلادی جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں مُسلمانوں کا ذہنی سکون کِس طرح برباد ہو رہے گا۔ اُن کا ضمیر کچھ اور ضابطوں کا طلب گار اور

(بقیہ حاشیہ صـــ۳۹) اِسلامی قانونِ وراثت سے مختلف ہیں۔ یکساں سِول کوڈ میں بھی ایسا ہی ہونا عین متوقع ہے۔ [۱] چنانچہ ہندو قانون میں ایسا ہی ہے۔

اُن کے لئے بے قرار ہوگا، اور وقت کا قانون انھیں اِن سے اصلاً بالکل مختلف ضابطوں میں باندھے جا رہا ہوگا۔ ضمیر اور عمل کی یہ مسلسل کشاکش انھیں جس طرح بے چین کیے رہے گی، اُسے سمجھنے کے لئے کسی کاوش کی ضرورت نہیں۔

(۴) اِسلام سے انحراف کی شہ

چوتھا نامبارک نتیجہ اس تجویز کا یہ نکلے گا کہ مسلمانوں میں جن کا اِسلام سے تعلق مختلف عوامل کی بنا پر یوں ہی خاصا کمزور اور مضمحل ہو چکا ہے —— دینی زوال کی ایک نئی لہر پیدا ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں اِس تجویز کا نفاذ اُن کے لئے اپنے دین سے مزید انحراف کی ایک زبردست شہ ثابت ہوگا۔ کسی بھی عقیدہ و مسلک کے پیروؤں کو اگر آپ اُن کے اپنے قوانینِ حیات سے روک کر کچھ دوسرے احکام و ضوابط کا پابند بنا دیں اور اُن کی زندگی کی گاڑی کو زبردستی کھینچ کر کسی اور ہی ڈگر پر ڈال دیں تو ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ اِس مسلک سے اُن کی وابستگی اعتقادی طور پر بھی بتدریج کم زور ہوتی چلی جائے گی۔ جہاں تک ان میں کے ایسے افراد کا تعلق ہے جن کا رابطہ اِس عقیدہ و مسلک سے صرف روایتی قسم کا ہوگا وہ تو یوں بھی اِس بدلے سانچے پر کوئی خاص بے چینی محسوس نہ کریں گے، لیکن اگر اِن جدید قوانین میں ان کی خواہشِ نفس کو کچھ چھوٹ بھی مل رہی ہوگی تب تو وہ انھیں پورے شوق سے قبول کر لینے کے لئے تیار ہو جائیں گے، اور اِس طرح اپنے روایتی مسلک سے ان کی نام نہاد وابستگی بھی ختم ہو جائے گی۔ گویا ان کے لئے یہ نئے قوانین اِس وابستگی کا جُوا اُتار پھینکنے کا ایک خوش آئند ذریعہ بن جائیں گے۔ رہے اس مسلک کے مخلص پیرو، تو شروع

میں وہ یقیناً بڑا کرب محسوس کریں گے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اُن کا یہ کرب بھی اپنی شدّت کھوتا چلا جائے گا، اور بالآخر اُن ہی کی اکثریت کو صبر آرہے گا۔ اِسلامی قوانین شخصی کی تنسیخ کا بھی یقینی طور پر یہی نتیجہ نکلے گا۔ یہ صرف ایک مجموعۂ قوانین کی تنسیخ نہ ہوگی بلکہ اس سے مسلمانوں کے لئے بالخصوص فراری ذہنیت والوں کے لئے اپنے دین سے انحراف کی راہ بھی ہموار ہوگی، اور ان کے دِلوں سے دینی احکام کی حُرمت کا احساس مُردہ ہو جائے گا۔ یہ کوئی خواہ مخواہ کا اندیشہ نہیں، بلکہ سر کی آنکھوں سے دِکھائی دینے والا ایک واقعی خطرہ ہے جس کے ثبوت کے لئے "اسپیشل میرج ایکٹ" ۱۹۵۴ء کے نتائج ہر شخص کے سامنے ہیں۔ اِس ایکٹ کی رُو سے کوئی بھی دو مرد عورت، خواہ اُن میں سے کسی کا تعلق کسی بھی فرقے اور مذہب سے ہو، عدالتِ مجاز کے سامنے جاکر باہم شادی کر لے سکتے ہیں۔ اِس ایکٹ کی دوسری دفعات کو چھوڑیئے۔ صرف اِسی ایک بات کو لے لیجئے کہ اِس کی رُو سے شادی کے قانونی طور پر جائز ہونے کے لئے مذہب کا اختلاف کوئی وجہ مانع نہیں بن سکتا، جب کہ قرآنی نصِّ صریح کی رُو سے مُسلمان عورت کا کسی بھی غیر مُسلم مَرد سے اور مُسلمان مَرد کا کسی بھی غیر کتابی غیر مُسلمہ سے نکاح حرام اور باطل ہے۔ لیکن قرآن کا یہ صریح حکم اور قانون اپنی جگہ پر، آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ کتنے ہی نام نہاد مسلمان مَردوں اور عورتوں کو مذکورہ ایکٹ بہائے لئے جا رہا ہے، اور انھوں نے مُسلمان ہوتے اور مُسلمان رہتے ہوئے بھی غیر مسلموں سے ازدواجی رشتے قائم کر لئے اور برابر قائم کیے چلے جا رہے ہیں — یہ نا شدنی تو اس حال میں وقوع پذیر

ہو رہی ہے جب کہ اِس ایکٹ کے مُطابق شادیاں کرنا بالکل ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف ایک اختیاری امر ہے، اور مُسلمانوں کا اپنا دینی قانون بھی نافذ ہے۔ لیکن اگر خدانہ کردہ کل کو یکساں سِول کوڈ کے ذریعہ اسے عام قانون بنا دیا گیا تو اندازہ کیجئے کہ اس وقت کِس طرح بند ٹوٹ جائے گا؟ اور مسلمانوں کے اندر اپنے دین وشریعت کا جو احترام ابھی تک بچا کھچا رہ گیا ہے، اُس پر کیا بیت جائے گی؟ اِس لئے اِس امر کے ایک حقیقت ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ یکساں سِول کوڈ کی تجویز جہاں اور بہت کچھ ہے، وہاں مُسلمانوں کو اسلام سے عملی اور ذہنی طور پر دُور کر دینے کا ایک زبردست ذریعہ بھی ہے۔

(۵) ملّی تشخص کی پامالی

ایک اور واضح نتیجہ اس تجویز پر عمل درآمد کا، ملّت کی انفرادیت کے خاتمہ اور اس کے تشخص کی موت کی شکل میں نمودار ہوگا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کِسی ملّت کا پرسنل لا اُس کی شخصیت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے بغیر وہ قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ اِس لئے مُسلمانوں پر سے شخصی قوانین کو ختم کر دینا دراصل اُن کی ملّی انفرادیت کو ختم کر دینا ہے۔ آج اگر وہ ایک مستقل کمیونٹی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں تو کل یکساں سِول کوڈ کی کان نمک میں ڈال دیئے جانے کے بعد اُن کی شخصیت اِس طرح تحلیل ہو جائے گی کہ شاید کِسی خوردبین ہی سے اُس کے کچھ خط و خال نظر آسکیں تو نظر آسکیں۔ نام اُن کا مُسلمان ملّت اور مُسلم کمیونٹی تو ضرور باقی رہے گا، مگر اس ملّیت کی کوئی نمایاں علامت اور پہچان حدودِ مسجد

سے باہر بمشکل ہی باقی دِکھائی دے سکے گی۔ اور حدودِ مسجد کے اندر باقی رہ جانے والی اِس علامت کا بھی حال یہ ہوگا کہ ہر نئی صبح گزری ہوئی شام کے مقابلے میں اِسے اور دُھندلی پاتی رہے گی۔ کیونکہ یکساں سول کوڈ کا رولر بالواسطہ اُسے بھی بتدریج مسلسل روندتا، دباتا اور مٹاتا رہے گا۔ یہ ایک ایسا فطری عمل ہوگا جسے مسلمان اپنی کسی بھی سعی اور تدبیر سے روک نہ سکیں گے۔ ان ناگزیر خطرات کے پیشِ نظر یہ کہنا ہرگز کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلامی قوانینِ شخصی کی پناہ گاہ اگر یکساں سول کوڈ کی بارود سے اُڑادی گئی تو مسلمانوں کی شخصیت کا محفوظ رہنا پھر کسی طرح ممکن نہ رہ جائے گا۔

اب آزادی کی یہ اُلٹی تعبیر

یکساں سول کوڈ کے اِن یقینی نتائج کا تصور کرتے ہی ایک مسلمان کا ذہن قدرتی طور پر آزادی کی اُس عظیم اور سرور آگیں نعمت کو حیرت اور حسرت سے یاد کرنے لگتا ہے جس سے یہ مُلک ایک طویل دَورِ غلامی کے عذاب سے نجات پاکر بہرہ ور ہوا ہے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آزادی کا جو سُنہری خواب دوسرے باشندگانِ مُلک کی طرح وہ بھی دیکھتا رہا ہے، اور صرف دیکھتا ہی نہیں رہا ہے بلکہ اُسے دِکھایا بھی جاتا رہا ہے، اُس کی یہ کیا عملی تعبیر ہے جو اُس کے حق میں نکل رہی ہے! جان و مال کی پیہم تاراجی، سرکاری درسیات کی مسلم آزاری اور اسلام دشمنی، ملّی تعلیم گاہوں کی ملّی کردار سے محرومی، اور اسی طرح کی اور بہت سی ناشدنیوں کے بعد اب مسلم پرسنل لا کے استیصال کی نئی اور خوف ناک مصیبت — کیا معقولیت اور انصاف کی نگاہ میں یہ صورتِ حال کسی طرح بھی حق بجانب

اور قابل برداشت قرار پاسکتی ہے؟ جب مُلک آزاد نہیں غلام اور مجبور تھا، جمہوریت نہیں بلکہ غیر مُلکی جبر اور استعمار اُس پر مُسلط تھا، اس وقت بھی مُسلمانوں کی ملّی شخصیت پر اِس طرح شبخوں پر شبخوں نہیں مارے گئے تھے، نہ غیر مُلکی آقاؤں کو اَن کے دینی جذبات اور شرعی قوانین کے بارے میں اِتنی بے دردی کی سُوجھی تھی کہ انھیں اُن کی عزیز ترین متاع ــــ اُن کے شخصی قوانین تک سے محروم کر کے رکھ دیتے۔ اس کے بخلاف اُنہوں نے اپنے تمام تر ظالمانہ اقدامات کے باوجود، اُنھوں نے باشندگانِ مُلک کے مذہبی جذبات کا بہت کچھ پاس رکھا، اور کسی فرقے کے پرسنل لا کو منسوخ نہیں کیا۔ ۱۸۶۴ء تک تو مُسلم پرسنل لا کے نفاذ اور مسلمانوں کے شخصی معاملات کے لئے الگ شرعی عدالتیں بھی قائم رہیں، جہاں مُسلمان قاضی مقرر ہوتے تھے۔ اِس کے بعد اگرچہ یہ عدالتیں باقی نہیں رہیں اور مُسلمانوں کے شخصی معاملات سے متعلق مقدمے بھی عام مُلکی عدالتوں کے حوالے کر دیئے گئے، لیکن جہاں تک اُن کے شخصی قوانین کا تعلق ہے وہ بدستور باقی اور نافذ رہے، اور اُنھیں کسی سُول کوڈ سے بدل دینے کا کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ جسٹس امیر علی انگریزوں کی اِس پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قانون انگلستان مجریہ ۲۱ جلوس جارج سوم باب ۷۰، دفعہ ۱۷ کی رُو سے طے پایا کہ کل مقدمات، جن کا تعلق آراضی کی وراثت و قائم مقامی از لگان و مال سے ہو، اور معاہدہ کی قسم سے جس قدر معاملات دائر ہوں، اگر فریقین مقدمہ مُسلمان ہوں

تو شرع اسلام اور اسلامی رسوم سے، اور اگر فریقین ہندو ہوں تو دھرم شاستر اور روایاتِ ہنود سے فیصلہ ہوگا...
۱۷۹۳ء میں حکم ہوا کہ وراثت، جانشینی، نکاح اور ذات اور تمام مذہبی رسوم کی نسبت اگر فریقینِ مقدمہ مُسلم ہوں تو حکامِ عدالت کو تصفیہ میں اُن کے عام احکام شرعی کا لحاظ کرنا ہوگا...... ایکٹ ۱۲ ۱۸۸۷ء دفعہ ۳۷ میں اِن رسوم کے جواز کی تائید میں کوئی بات نہیں قرار دی گئی جو عام مسائلِ شرعیہ کے خلاف اور مغایر ہوں۔" (پرنسپلز آف محمڈن لا، بحوالہ مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام ص۱۱۵، ۱۱۶)

نیز یہ کہ:-

"قانون ۳۹ دفعہ ۱۷، شاہ جارج سوم میں صاف لکھا ہے کہ ہندوستان میں شرع محمدی کی پابندی مُسلمانوں کے سب مقدمات میں ٹھیک ٹھیک اور بلا رُو رعایت کی جائے۔"
(اُردو ترجمہ پرسنل لا آف دی محمڈنس ج اوّل ص۱۰۵، ۱۰۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"بمقدمۂ منشی بذل الرحمان بنام شمس النساء بیگم (مورس انڈین اپیلیس جلد ۱۱ ص۶۱۴) ہائی کورٹ کلکتہ نے شرع محمدی کی پابندی سے انکار کیا تھا، اس کی نسبت حکام عدالت العالیہ پریوی کونسل نے تقریرِ ذیل لکھی ہے:-

"حکام پریوی کونسل، ہائی کورٹ کلکتہ کی اِس رائے سے بالکل اختلاف کرتے ہیں ..... حکام پریوی کونسل کے ذہن میں کوئی امر ایسا نہیں آتا جس سے مسلمانوں کو اِس قدر خوف اور اندیشہ ہو جس قدر یہ جاننے سے پیدا ہوگا کہ ہائی کورٹ نے ایک ایسا فیصلہ کیا ہے جس سے اُن کی شرع، جس کی پابندی کی ضمانت، اُن کے مقدمات میں، اُن سے کر لی گئی ہے، ایسے مقدمہ میں بالائے طاق رکھ دی گئی ہے جو اُن کے خانگی تعلقات سے تعلق تام رکھتا ہے۔" (اردو ترجمہ "پرسنل لا آف دی محمڈنس" جلد دوم ص ۲۸)

بلاشبہ انگریزی دور میں مسلم پرسنل لا کے باقی و محفوظ رکھے جانے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ وہ فی الواقع کلیتہً اپنی اصل شکل میں باقی رہا تھا، اس کے نفاذ کے طریقے بالکل صحیح اختیار کیے گئے تھے، اور اس ضمن کی نازک ذمہ داریاں پوری قابلیت اور احتیاط سے ادا کی گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم حکمرانوں، قانون دانوں اور ججوں سے ایسی توقع کی ہی نہیں جا سکتی۔ لیکن یہاں بحث مسلم پرسنل لا کے نفس وجود سے اور اُس کے فی الجملہ نفاذ سے ہے، نہ کہ اس کے نفاذ کے لئے ضروری شرائط و لوازم اور آداب سے۔ اور جہاں تک مسلم پرسنل لا کے نفس وجود و بقا اور اس کے نفاذ کا سوال ہے، یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ۱۵ اگست ۴۷ء کو جب انگریز یہاں سے رخصت ہوئے ہیں تو اُسے باقی اور نافذ چھوڑ کر رخصت ہوئے ہیں، حتیٰ کہ اس بقا و نفاذ کا تسلسل ابھی تک قائم چلا آرہا ہے۔

اب انصاف، معقولیت، رُوحِ جمہوریت اور آزادی کا تقاضا کیا تھا؟ اگر غیروں کی محکومی اور بیرونی استبداد کے جُوئے تلے بھی مسلمانوں کا شرعی قانون باقی رکھا گیا تھا تو کیا آزادی ملنے کے بعد یہ توقع کوئی بے جا توقع تھی کہ یہ قانون نہ صرف یہ کہ باقی رکھا جائے گا بلکہ دورِ غلامی میں اس کے اندر جو نقص پیدا ہو گیا تھا اُسے دُور کرنے کا فوری اہتمام کیا جائے گا' اور اُس کے نفاذ کے لئے شرعی عدالتیں بھی مستقل طور قائم کر دی جائیں گی' اور اُن میں مُسلمان قاضی مقرر کئے جائیں گے۔ کیونکہ شرعی معاملات کے فیصلے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ اسلامی قوانین کے مطابق فیصل کیے جائیں، بلکہ ازرُوئے شرع یہ بھی ضروری ہے کہ یہ فیصلے کرنے والے حُکام خود بھی اس قانون پر ایمان رکھتے ہوں۔ لیکن اِس توقع کے پُوری ہونے کو کون کہے، نفس مُسلم قوانینِ شخصی ہی کا صفایا کر دینے کی جی توڑ کوششیں ہو رہی ہیں۔ آزادی کا خواب کیا تھا، تعبیر کیا نکل رہی ہے!

مسلم پرسنل لا

وقت کا اہم ترین مسئلہ

مسلم پرسنل لا (سیمینار) انگریزی — ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

مسلم پرسنل لا اور یکساں سول کوڈ — شمس پیرزادہ (اردو، ہندی، انگریزی)

مسلم پرسنل لا اہمیت، افادیت اور ضرورت — محمد یوسف، سابق امیر جماعت اسلامی ہند (اردو)

مسلم پرسنل لا۔ دینی و ملی نقطۂ نگاہ سے — مولانا صدرالدین اصلاحی "

محمڈن لا اور اس میں تبدیلی — مولانا سید حامد علی "

مسلم پرسنل لا پر اعتراضات کی حقیقت
تاریخ اور اسلامی نظامِ معاشرت کی روشنی میں — پروفیسر عمر حیات خاں "

یکساں سول کوڈ اور مسلمان — مولانا صدرالدین اصلاحی "

نفقۂ مطلقہ اور پارلیمنٹ میں بیجا وکالت — مولانا سید احمد عروج قادری "

تحفظ شریعت: مشکلات اور حل — محمد شفیع مونس، سکریٹری جماعت اسلامی ہند "

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

سرورق ٹائیٹل فوٹو کریسنٹ پرنٹرز حویلی اعظم خاں دہلی میں چھپا